بعض قرآنی آیات پر اعتراضات کی حقیقت

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآن کریم پر اعتراضات کا سلسلہ اس کے زمانۂ نزول ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ مشرکینِ مکہ نے، جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے، اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے۔ کبھی اسے گھڑی ہوئی کہانیاں (اساطیر) قرار دیا تو کبھی شعر، کہانت یا جادو کہا۔ اور پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد یہود کی جانب سے بھی برملا، قرآن پر مختلف اعتراضات کیے جانے لگے۔ قرآن نے ان تمام اعتراضات کا مدلّل جواب دیا۔ بعد کے زمانوں میں بھی قرآن پر اعتراضات و الزامات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مراد یہ کہ ہر دور میں دشمنانِ اسلام نے قرآن کو نشانہ بنایا۔ اس سلسلے میں خصوصیت سے مستشرقین (Orientalists) پیش پیش رہے ہیں اگرچہ انھوں نے قرآنیات کے میدان میں اہم تحقیقی اُمور انجام دیے، لیکن ان کے پس پردہ، اسلام دشمنی کارفرما رہی ہے۔ انھوں نے قرآن کی حقیقی تعلیمات کو مسخ کرنے اور اس کی جانب بے بنیاد باتیں منسوب کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

مثال کے طور پر چند برس قبل ہندو انتہاپسند تنظیم 'اکھل بھارتیہ ہندو مہاسبھا' نے 'دیش میں دنگے کیوں ہوتے ہیں؟' کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا، جس میں قرآن کی ۲۴ آیتوں کے اجزا نقل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی: 'قرآن، مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے جھگڑا کرنے کا حکم دیتا ہے'۔ اور کہا گیا تھا: 'جب تک ان آیات کو قرآن سے نکالا نہیں جاتا یہاں کے جھگڑوں کو نہیں روکا جاسکتا'۔ انھی الزامات کے تحت کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا اور قرآن پر پابندی عائد کروانے کی کوشش کی گئی تھی، مگر فاضل ججوں نے موقف سننے کے بعد مقدمہ خارج کردیا تھا۔ افسوس کہ اب یہی بات ایک ایسے شخص کی جانب سے کہی گئی ہے

جس کا نام مسلمانوں جیسا ہے۔اس نے بھارتی سپریم کورٹ میں ایک عرضی داخل کی ہے کہ ''ان آیات کو قرآن مجید سے خارج کر دیا جائے''۔

آیندہ سطور میں مذکورہ بالا اعتراضات کا تذکرہ کر کے ان کا جائزہ پیش کیا جائے گا:

۱- لفظ 'کافر' کا مفہوم

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ''قرآن نے اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے لفظ 'کافر' استعمال کیا ہے۔ان میں 'ہندو' بھی شامل ہیں۔اس لفظ میں نفرت اور حقارت کا مفہوم شامل ہے۔کافروں کے بارے میں قرآن میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے دنیا میں جس طرح کا معاملہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور مرنے کے بعد دوسری دنیا میں ان کے ساتھ جیسا معاملہ کیے جانے کی خبر دی گئی ہے، انھیں پڑھ کر مسلمانوں کے دلوں میں ان سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور ان سے دُور رہنے اور ہر طرح کا تعلق منقطع رکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لفظ 'کافر' کا یہی مفہوم ہے؟ عربی زبان میں لفظ 'کفر' کے اصل معنٰی چھپانے اور ڈھانکنے کے ہیں۔عربوں کے کلام میں اس مادہ سے جتنے الفاظ آئے ہیں، سب میں یہ معانی کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ماہر لغت ابن درید الازدی نے لکھا ہے:

وَأَصْلُ الْكُفْرِ التَّغْطِيَةُ عَلَى الشَّيْءِ (جمہرۃ اللغۃ، ج۱،ص ۴۳۵) کفر کی اصل ہے کسی چیز کو ڈھانک لینا۔

اسی لیے اہلِ عرب لفظ 'کافر' کا اطلاق ہر اس چیز پر کرتے ہیں، جو کسی چیز کو ڈھانپ لے۔ مثال کے طور پر ان کے کلام میں درج ذیل چیزوں کے لیے اس لفظ کا استعمال ملتا ہے:

- 'رات' کہ وہ اپنی تاریکی سے تمام چیزوں کو ڈھانپ کر نگاہوں سے پوشیدہ کر دیتی ہے۔
- سمندر: کہ وہ بڑی سے بڑی چیز کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔
- بڑی وادی: کہ اس میں پہنچ کر لوگ دوسروں کی نگاہوں سے چھپ جاتے ہیں۔
- دریا: کہ وہ اپنے اندر چھوٹی بڑی چیزوں کو چھپا لیتا ہے۔
- گہرا بادل: کہ وہ ستاروں، چاند اور سورج کو چھپا لیتا ہے۔
- کسان: کہ وہ زمین میں بیج ڈال کر اسے چھپا دیتا ہے۔

- زرّہ: کہ وہ فوجی کے جسم کو چھپا لیتی ہے۔
- دُور دراز کا علاقہ جہاں کسی کا گزر نہ ہو: کہ وہاں رہنے والے عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔(القاموس، فیروز آبادی)

اسی طرح عربی زبان میں 'کفر' ناشکری کے معانی میں بھی آتا ہے۔ اس میں بھی اس کے اصلی معانی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص کسی کی ناشکری کرتا ہے، وہ گویا اپنے محسن کے احسان کو چھپا دیتا ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ جمہرۃ اللغۃ میں ہے:

وَ کَفَرَ فُلَانٌ النِّعْمَةَ إِذَا لَمْ يَشْكُرْهَا (جمہرۃ اللغۃ، ابن درید، ج ۱، ص ۴۳۵)
(فلاں نے نعمت کا کفر کیا، یعنی اس پر شکریہ ادا نہیں کیا)

البتہ عربی زبان میں لفظ 'کفر' کا غالب استعمال، اسلام و ایمان کے بالمقابل ایک اصطلاح کے طور پر ہوتا ہے۔ ماہرینِ لغت میں ازدی نے لکھا ہے: اَلْكُفْرُ ضِدُّ الْإِسْلَامِ (کفر اسلام کی ضد ہے)۔ جوہری اور فیروز آبادی کہتے ہیں: اَلْكُفْرُ ضِدُّ الْإِيمَانِ (کفر ایمان کی ضد ہے)۔

قرآن کریم میں لفظ 'کفر' کا استعمال مختلف لغوی معانی کے لیے بھی ہوا ہے، اور ایمان کے بالمقابل اصطلاح کے طور پر بھی۔ ایک مقام پر وہ اصل لغوی معانی 'چھپانے' میں آیا ہے۔ دنیاوی زندگی کو لہو و لعب قرار دیتے ہوئے اس کی یہ مثال بیان کی گئی ہے:

كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ (الحدید ۵۷:۲۰) اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔

اس آیت میں کسانوں کے لیے لفظ 'کفّار' لایا گیا ہے۔ کسان کو 'کافر' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کھیتی کے دوران بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ بعض مقامات پر اس کا استعمال شکر کے بالمقابل ناشکری کے معنوں میں ہوا ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾ (البقرہ ۲:۱۵۲) لہٰذا، تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری نہ کرو۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿۳﴾ (الدھر ۷۶:۳) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، اب خواہ وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

اور چوں کہ ناشکری نعمت کے انکار کو مستلزم ہے، اس لیے بعض مقامات پر یہ انکار اور برأت کے معانی میں آیا ہے:

اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ (العنکبوت۲۹:۲۵) تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے، مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے۔

اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں۔ یہاں دو آیات مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں:

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ (البقرہ۲:۱۰۸) جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہِ راست سے بھٹک گیا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (البقرہ۲: ۸۵) کیا تم کتاب کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟

مفسرین اور ماہرین لغت نے صراحت کی ہے کہ لفظ 'کافر' میں وہ تمام معانی پائے جاتے ہیں، جن کے لیے اس کا عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے:

علامہ ابن جوزیؒ نے لکھا ہے: ''لغت میں کفر کے معنٰی چھپانے کے ہیں۔ کافر کو کافر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حق پر پردہ ڈال دیتا ہے''۔ (زادالمیسر: ج۱،ص ۲۷۲)

جوہری فرماتے ہیں: ''کافر کو کافر اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کے احسانات کا انکار کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کو چھپالیتا ہے''۔ (تاج اللغۃ: ج۱،ص ۳۹۵)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض مسلمانوں کی جانب سے ایک خیال یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ''ایسے ہر شخص کو جو اسلام کی اساسیات پر ایمان نہ رکھتا ہو، کافر نہیں کہا جاسکتا، یہ لفظ 'غیر مسلم' کے مترادف نہیں ہے۔ کافر اسی شخص کو کہا جاسکتا ہے، جس تک اسلام کی دعوت پہنچائی جائے اور اس پر اتمامِ حجت کر دی جائے، اس کے باوجود وہ اسلام قبول نہ کرے۔ اتمامِ حجت کے بعد بھی متعین طور پر کسی کو کافر نہیں کہا جاسکتا''۔ لیکن یہ صحیح بات نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ 'کافر' کا استعمال 'ایمان' اور 'اسلام' کے

بالمقابل ہوا ہے۔ جو شخص بھی اللہ کے دین کو نہ مانے اور اسلامی عقائد کو تسلیم نہ کرے، وہ کافر ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات کریمہ میں لفظ کفر کی نسبت یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی طرف کی گئی ہے۔

اسلام اصولی طور پر دینِ حق کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان فرق کرتا ہے، تاکہ اس کے احکام کے نفاذ کے معاملے میں دونوں کے ساتھ الگ الگ برتاؤ کیا جاسکے۔ دین حق کے ماننے والوں کو ان احکام کا پابند بنایا جاسکے اور نہ ماننے والوں کو ان کی پابندی سے مستثنیٰ رکھا جاسکے۔ جہاں تک لغوی معانی کا تعلق ہے، اس لفظ کے ذریعے نہ غیر مسلموں سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے اور نہ اس میں لغوی طور پر بُغض، نفرت، حقارت اور ذلّت کے معانی پائے جاتے ہیں۔

۲- کافروں کے بارے میں عذابِ جہنم کے بیان سے نفرت پیدا ہوتی ہے

ہندو اور مغربی معترضین کی جانب سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ''قرآن میں جہنم کے عذاب کا تذکرہ تفصیل سے کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اسلام قبول نہیں کریں گے، انھیں جہنّم کا عذاب دیا جائے گا''۔ مثال کے طور پر وہ ان آیات کا حوالہ دیتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء ۴:۵۶) جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ جَزَاۗءُ اَعْدَاۗءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ (حٰم السجدۃ ۴۱:۲۷-۲۸) ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزہ چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔

کافروں کو آخرت میں دی جانے والی جو سزائیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں، وہ غیر مسلموں سے نفرت پیدا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل و انصاف کے عین مطابق ہیں۔ یہ سزائیں اہلِ ایمان کے دلوں میں کافروں سے نفرت وحقارت نہیں، بلکہ ہم دردی پیدا کرتی ہیں اور انھیں آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے ان بھائیوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی جدوجہد کریں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس دنیا میں پیدا کیا اور انھیں بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ ان کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کے احکام بجا لائیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ حقیقت میں بڑے ناشکرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ (النحل ۱۶:۷۲) پھر کیا یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر یا اس کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں، جو حقیقت میں نہ انھیں کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، وہ اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا رویّہ بغاوت کے مترادف ہے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا، جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اس کے احکام سے روگردانی کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی نگاہ میں مجرم ہیں۔ اس نے ان کے لیے آخرت میں ایسی ہی سزائیں تجویز کر رکھی ہیں، جن کے وہ مستحق ہیں:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾ (یونس ۱۰:۱۷) پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا، جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے، یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔

یہ دنیا 'دارالامتحان' ہے اور آخرت 'دارالجزا'۔ یہاں انسان جیسے کام کرے گا، اس کا بدلہ آخرت میں پائے گا۔ جو لوگ دنیا میں اللہ کے باغی اور مجرم بن کر رہیں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں، انھیں آخرت میں سخت سزائیں دی جائیں گی۔ فرماں بردار اور نافرمان، اطاعت گزار اور سرکش، نیک اور مجرم، دونوں کے انجام میں فرق کرنا عین تقاضائے انصاف ہے، لیکن یہ فرق آخرت میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کرے گا۔ اس سے دنیا میں غیر مسلموں کے انسانی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۳- مشرکین نجس ہیں

کہا جاتا ہے کہ قرآن میں ہندوؤں کو ناپاک اور گندا کہا گیا ہے۔ اس تعبیر سے ان کے خلاف نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے۔ معترضین کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ (التوبۃ۹:۲۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مشرکین نجس ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔

اس آیت میں نجاست سے مراد جسمانی اور مادّی گندگی نہیں ہے، بلکہ عقیدہ کی خرابی اور شرک کی آلودگی ہے۔ اس پر مفسّرین اور علما کا اتفاق ہے۔

امام نوویؒ کے مطابق: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، مشرکین نجس ہیں۔ اس سے مراد عقیدے کی نجاست اور گندگی ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ پیشاب پاخانہ جیسی چیزوں کی طرح نجس ہیں''۔

اسلام عقیدے کے معاملے میں کوئی مداہنت اور رورعایت نہیں برتتا۔ وہ توحید کا علَم بردار اور شرک کے سخت خلاف ہے۔ اس کے نزدیک شرک ایسی گندگی ہے، جس سے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے والے کا ذہن آلودہ ہوجاتا ہے۔ وہ اس گندگی سے انسانوں کو پاک صاف رکھنا چاہتا ہے۔ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کے علَم بردار تھے۔ انھوں نے اللہ واحد کی عبادت کے لیے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی، لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ان کے پیرو شرک میں مبتلا ہوگئے تھے۔ وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ متعدد دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگے تھے۔ خانۂ کعبہ کی دیواروں میں انھوں نے مورتیاں نصب کر رکھی تھیں اور مسجد حرام میں ۳۶۰ بت رکھ دیے تھے۔ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد جب وہاں کا اقتدار توحید کے قائلین کے ہاتھ میں آیا، تو یہ امر فطری تھا کہ وہ توحید کے مرکز کو شرک کے ان مظاہر سے پاک کردیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے اگلے سال حج کے موقعے پر اعلانِ عام کردیا گیا کہ ''خانۂ کعبہ اللہ کا گھر ہے اور مسجدِ حرام کو مقدّس مقام کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے شرک کی آلودگیوں میں مبتلا لوگوں کو آیندہ یہاں داخلے کی اجازت نہیں ہے''۔

جہاں تک کافروں اور مشرکوں کے ظاہر کا تعلق ہے، اسلام نہ تو انھیں گندا قرار دیتا ہے اور نہ محض اس بنیاد پر ان سے الگ تھلگ یا دُور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور

آپؐ کے اصحاب کفار ومشرکین کے درمیان رہتے تھے۔ ان سے آپ کا ملنا جلنا رہتا تھا، وہ مسجد میں آتے تھے، آپؐ اور آپؐ کے اصحاب ان کے برتنوں سے پیتے اور وضو کرنے کے لیے پانی لیتے، ان کا بنایا ہوا کھانا کھالیتے اور ان کے تیار کیے ہوئے کپڑے پہن لیتے تھے۔ ایسا نہیں ہوا کہ جن چیزوں پر ان کا ہاتھ لگتا ہو، یا جو چیزیں ان کے بدن کے کسی حصّے سے مَس ہوتی ہوں، انھیں دھوئے جانے کا آپؐ نے حکم دیا ہو۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ بیان فرماتے ہیں کہ قبیلۂ ثقیف کا وفد آیا تو اسے مسجدِ نبوی میں ٹھیرایا گیا۔ بعض صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! یہ لوگ تو مشرک ہیں'' (شاید ان کی مراد یہ تھی کہ ان کی وجہ سے مسجد ناپاک ہوجائے گی)۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ الْاَرْضَ لَا یُنَجِّسُهَا شَیْءٌ (مصنف عبدالرزاق، کتاب الصلوٰۃ، باب المشرک یدخل المسجد، حدیث: ۱۵۵۸) زمین اس جیسی کسی چیز سے ناپاک نہیں ہوتی۔

حضرت عمران بن حصینؓ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر کا حال بیان کرتے ہیں کہ راستے میں ایک پڑاؤ پر پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کچھ صحابہ تلاش کے لیے نکلے۔ ایک غیر مسلم عورت پانی کے دو مشکیزوں کے ساتھ ملی۔ وہ اسے آں حضرتؐ کے پاس لے آئے۔ آپؐ نے اور تمام صحابہ نے اس سے پانی لے کر اپنی پیاس بجھائی۔ (صحیح البخاری: ۳۵۷۱، مسلم: ۶۸۲)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ ہم جنگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے۔ غیر مسلموں کے کھانے پینے کے جو برتن ہمارے ہاتھ لگتے تھے، انھیں ہم استعمال کرتے تھے۔ اس پر آپ ہماری کچھ نکیر نہیں کرتے تھے۔ (ابوداؤد: ۳۸۳۸)

حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر مسلموں کے ان برتنوں کے بارے میں دریافت کیا، جن کے متعلق امکان ہو کہ ان میں وہ خنزیر کا گوشت پکاتے اور شراب پیتے رہے ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر دوسرے برتن موجود ہوں تو ان مشتبہ برتنوں کو نہ استعمال کرو، [اور وہ] موجود نہ ہوں تو انھی کو اچھی طرح دھوکر استعمال کرسکتے ہو۔ (بخاری: ۵۴۹۶، مسلم: ۱۹۳۰)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ مشرکین کی نجاست سے مراد عقیدے کی خرابی ہے، نہ کہ

ظاہری گندگی۔ جہاں تک انسانی تعلقات اور زندگی کے عام معاملات کا سوال ہے، ان میں مشرکین کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھا گیا ہے اور کسی حال میں ایسا رویہ نہیں اختیار کیا گیا ہے، جس سے ان کے سلسلے میں نفرت اور حقارت کا اظہار ہو۔

۴- کافروں سے دوستی کی ممانعت

معترضین کی جانب سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ''قرآن میں مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے سے منع کیا گیا ہے اور انھیں دشمن کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دشمنوں کے بارے میں نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور انھیں نقصان پہنچانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں''۔ اس اعتراض پر بہ طور دلیل اس طرح کی آیات پیش کی جاتی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ (النساء ۴:۱۴۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ (الممتحنۃ ۶۰:۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالاں کہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں۔

ان آیات پر ان کے صحیح تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے کہ وہ کافروں کو 'اولیاء' نہ بنائیں۔ 'اولیاء' ولی کی جمع ہے۔ اس کا مصدر 'ولاء' ہے۔ 'ولاء' کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد چیزیں اس طرح یکجا ہوں کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہو، جو ان سے متصادم ہو۔ اسی سے استعارۃً یہ لفظ 'قربت' کے معانی میں استعمال ہونے لگا، خواہ یہ قربت جگہ، تعلق کی، یا مذہب، دوستی اور عقیدے کی ہو۔ جس شخص سے مذکورہ نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا تعلق ہو، اس کے لیے 'ولی' اور 'مولیٰ' دونوں الفاظ مستعمل ہیں۔

لفظ 'مولیٰ' کا اطلاق عربی زبان میں بہت سے لوگوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً ربّ، مالک، آقا، محسن، غلام آزاد کرنے والا، مددگار، محبت کرنے والا، تابع داری کرنے والا، پڑوسی، چچازاد بھائی، حلیف، جس سے عہد و پیمان ہو، قرابت دار (داماد)، غلام، آزاد کردہ غلام، جس پر احسان کیا جائے۔

علامہ ابن اثیرؒ فرماتے ہیں: اس لفظ کا استعمال حدیث میں ان میں سے بیش تر معانی میں ہوا ہے۔ ہر جگہ سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن معنوں میں آیا ہے۔ (النہایۃ: ۴/ ۱۳۲)

مذکورہ بالا آیتوں اور ان جیسی دیگر آیتوں میں لفظ 'اولیاء' انتہائی قربت کے معنٰی میں آیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

اَوْلِيَاءَ: أَيْ لَا تَجْعَلُوْا خَاصَّتَكُمْ وَبِطَانَتَكُمْ مِنْهُمْ (تفسیر قرطبی: ج۵، ص ۵۲۴) کافروں کو اپنا ولی، یعنی بہت قریبی اور راز دار نہ بناؤ۔

علامہ زمخشریؒ اس کا یہ مفہوم بتاتے ہیں:

لَا تَتَّخِذُوْهُمْ أَوْلِيَاءَ تَنْصُرُوْنَهُمْ وَتَسْتَنْصِرُوْنَهُمْ وَتُوَاخُوْنَهُمْ وَ تُصَافُوْنَهُمْ وَتُعَاشِرُوْنَهُمْ مُعَاشَرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ (کشاف: ج۱، ص ۶۴۲) کافروں کو اولیاء نہ بناؤ، یعنی ان سے تمھارا معاملہ ایسا نہ ہو کہ تم ان کی مدد کرو، ان سے مدد چاہو، ان سے بھائی چارہ اور خلوص ومحبت کے تعلقات رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہو، جس طرح اہل ایمان باہم رہتے ہیں۔

ان حالات کو بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، جن میں مسلمانوں کو کافروں سے قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا تھا۔ مسلمان سخت حالات سے گزر رہے تھے۔ ان کے خلاف ان کے دشمنوں نے جنگ برپا کر رکھی تھی اور انھیں بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھے۔ یہود ونصاریٰ کا رویہ کھلی دشمنی پر مبنی تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دے رہے تھے۔

تیسرا گروہ 'منافقین' کا تھا جو ظاہر میں اسلام کا دم بھرتے تھے اور انھوں نے خود کو مسلمانوں میں شامل کر رکھا تھا، لیکن حقیقت میں وہ کافروں کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے اور انھیں کچھ نقصان پہنچتا تو خوشیاں مناتے تھے۔ یہ سارے لوگ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر متحد تھے۔ ایسے حالات میں اپنے دشمنوں سے قریبی تعلق رکھنا مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک تھا۔ یہ چیز دینی حیثیت سے بھی ضرر رساں تھی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اسی لیے قرآن نے الگ الگ ہر گروہ کے بارے میں وضاحت سے مسلمانوں کو تاکید کی کہ ان سے 'ولایت' کا تعلق نہ رکھیں۔ کفّار کے بارے میں کہا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ (النساء ۴:۱۴۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔

یہود و نصاریٰ سے تعلقات کے بارے میں بھی یہی حکم دیا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ (المائدہ ۵:۵۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے۔

منافقین کے بارے میں فرمایا:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِیَآءَ (النساء ۴:۸۹) وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ، تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا، ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔

اس معاملے میں قرآن نے اس حد تک تاکید کی کہ جن لوگوں کے باپ اور بھائی دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے ہیں اور انھوں نے ایمان پر کفر کو ترجیح دی ہے، ان سے بھی قربت کا ویسا تعلق نہ رکھا جائے، جیسا کہ اہل ایمان کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ مبادا ان کے واسطے مسلمانوں کے راز کفار تک پہنچ جائیں:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ (التوبۃ ۹:۲۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

قرآن کریم کی بعض آیات میں ان اسباب کی وضاحت کر دی گئی ہے، جن کی بنا پر مسلمانوں کے علاوہ دوسروں سے قربت کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ (المائدہ ۵:۵۷) اے لوگو جو ایمان لائے

ہو! تمھارے پیش رَو اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنالیا ہے، انھیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (الممتحنہ ۶۰:۱) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

اسی سورت میں آگے ہے:

اِنَّمَا یَنْہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰہَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْہُمْ ۚ وَمَنْ یَّتَوَلَّہُمْ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (الممتحنہ ۶۰:۹) وہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو، جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ ان لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے، اس کے سلسلے میں وہ سنجیدگی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ تمھارے دشمن ہیں، اور تیسری آیت میں یہ وضاحت کی گئی کہ وہ محض دین کی وجہ سے تم سے جنگ کر رہے ہیں، تمھیں تمھارے وطن سے نکالا ہے یا اس میں مدد کی ہے۔ یہ اسباب بجا طور پر اس بات کے متقاضی تھے کہ ان سے قریبی تعلق نہ رکھا جائے۔

یہی مضمون آل عمران میں یوں مذکور ہے:

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاہِہِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُہُمْ اَکْبَرُ ؕ (آل عمران ۳:۱۱۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ وہ تمھاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے۔ تمھیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔

اس آیت میں لفظ بطانۃ کے استعمال میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔'بطانۃ' کپڑے کے اندرونی حصّے کو کہتے ہیں، جو جسم سے متصل ہوتا ہے۔ بہ طور استعارہ اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے، جسے آدمی اپنا گہرا دوست، ہم دم اور ہم راز بنالے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں سے اتنا قریبی تعلق استوار نہ کرلو کہ ان پر اپنے راز منکشف کردو۔ اس لیے کہ وہ لوگ تمھارے بہی خواہ نہیں ہیں، تمھیں نقصان پہنچانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور تم سے دشمنی اور نفرت ان کے رویّے سے عیاں ہے۔

قریبی تعلق سے ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو عام غیرمسلموں کے ساتھ انسانی تعلقات رکھنے سے بھی منع کیا گیا ہے، بلکہ ممانعت صرف ایسا تعلق رکھنے کی ہے، جس سے اسلامی ریاست کے سیاسی وعسکری راز دشمنوں پر افشا ہوجائیں اور مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ ہوجائے۔ یہ ممانعت صرف ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہوں یا ان کے دشمنوں کے مددگار بنے ہوئے ہوں۔ رہے وہ غیرمسلم جو مسلمانوں کے ساتھ مصروفِ جنگ نہ ہوں اور نہ ان کا طرزِعمل عداوت اور ظلم وستم پر مبنی ہو، ان کے ساتھ عدل وانصاف کرنے، اچھے تعلقات رکھنے اور بھلا برتاؤ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝۸ (الممتحنۃ۶۰: ۸)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غیرمسلموں سے تعلقات کے سلسلے میں یہ ایک بہت بنیادی آیت ہے۔اس میں دو الفاظ آئے ہیں: أَنْ تَبَرُّوْهُمْ اور تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ۔'برّ' سے مراد ہے حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنا۔ اس میں زیادہ حسن سلوک کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے(البِرّ: التوسع فی الاحسان الیہ) [راغب اصفہانی] تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ کے معنٰی بعض مفسرین نے یہ بیان کیے ہیں کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا

معاملہ کرو، جب کہ بعض دیگر مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ صلہ رحمی کے طور پر اپنے مال کا کچھ حصّہ انھیں دو: أَنْ تُعْطُوْهُمْ قِسْطًا مِنْ أَمْوَالِكُمْ عَلٰى وَجْهِ الصِّلَةِ۔ [ابن العربی، ماوردی، قرطبی]

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے:

هٰذِهِ الآيَةُ رُخْصَةٌ مِنَ اللهِ تَعَالٰى فِيْ صِلَةِ الَّذِيْنَ لَمْ يُعَادُوْا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلَمْ يُقَاتِلُوْهُمْ (تفسیر قرطبی: ج۱۸،ص۵۹) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی اجازت دی ہے جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں کی اور ان سے جنگ نہیں کی۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں:

قَالَ أَهْلُ التَّأْوِيْلِ: هٰذِهِ الآيَةُ تَدُلُّ عَلٰى جَوَازِ الْبِرِّ بَيْنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَإِنْ كَانَتِ الْمُوَالَاةُ مُنْقَطِعَةً (تفسیر کبیر: ج۲۹،ص۵۲۱) مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان نیکی اور حُسن سلوک کا معاملہ جائز ہے، اگرچہ ان کے درمیان موالات (یعنی قریبی تعلق رکھنا) ممنوع ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ غیر مسلموں سے ہر طرح کے تعلق سے منع نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ممانعت صرف 'ولایت' یعنی مخصوص قسم کے قریبی تعلق کی ہے۔ جہاں تک عام انسانی اور سماجی تعلقات رکھنے کی بات ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

اَلْإِحْسَانُ وَالْهِبَةُ مُسْتَثْنَاةٌ مِنَ الْوِلَايَةِ (تفسیر قرطبی: ج۸،ص۹۴)

غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور انھیں کچھ دینا 'ولایت' میں شامل نہیں ہے۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے: ''مومن کے کافر کو 'ولی' بنانے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- وہ اس کے کفر کو پسند کرتا ہو، اس کے باوجود اس سے دوستانہ تعلقات رکھتا ہو۔

۲- اس کو برسر باطل سمجھنے کے باوجود رشتہ داری یا قلبی تعلق کے سبب اس کی طرف مائل ہو، اس سے تعاون، حمایت اور نصرت کرتا ہو۔

۳- دنیاوی معاملات میں اچھے تعلقات کا اظہار کرتا ہو۔

اوّل الذکر دو صورتیں ممنوع ہیں، تیسری صورت ممنوع نہیں ہے‘‘۔ (تفسیر کبیر: ج ۲،ص ۴۵۰)

۵- مخالفوں سے لڑنے اور انھیں قتل کرنے کے احکام

معترضین کی جانب سے قرآن پر ایک بڑا، بلکہ شاید سب سے بڑا اعتراض اس کے تصوّرِ جہاد پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ’’قرآن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کافروں اور مشرکوں سے جنگ کریں، ان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں، ان کے لیے گھات لگائیں اور انھیں جہاں پائیں قتل کریں‘‘۔ بہ طور دلیل یہ آیات پیش کی جاتی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ط (التوبۃ۹:۱۲۳) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جنگ کرو ان کافروں سے جو تمھارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ (التوبۃ۹:۵) تو مشرکوں کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (التحریم۶۶:۹) اے نبیؐ! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (التوبۃ۹: ۱۴) ان سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انھیں ذلیل و خوار کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمھاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ

يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ۝۲۹ (التوبۃ۹: ۲۹) جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس طرح آیاتِ مقدسہ پیش کر کے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ''جب تک یہ آیات موجود ہیں، اس وقت تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بقائے باہم ممکن نہیں''۔

یہ غلط فہمی، درحقیقت جنگ کے بارے میں قرآن کے احکام و تعلیمات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے اور متعلقہ آیات کو ان کے سیاق و سباق سے ہٹا کر پڑھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے:

● اسلام جبر و اکراہ کا مخالف ہے۔ قرآن میں یہ بات بہت زور دے کر کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سامنے حق واضح کر دیا ہے، ساتھ ہی انھیں ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی ہے کہ وہ چاہیں تو اسے قبول کر کے دائرۂ اسلام میں آجائیں اور چاہیں تو کفر کی روش پر قائم رہیں:

اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا۝۳ (الدھر۷۶: ۳) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

وَقُلِ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ‌ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ‌ (الکہف۱۸: ۲۹) صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمھارے ربّ کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔

● جب مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستایا جانے لگا، تب انھیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اُوپر ہونے والے ظلم کا جواب دے سکتے ہیں:

اُذِنَ لِلَّذِيۡنَ يُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّهُمۡ ظُلِمُوۡا‌ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصۡرِهِمۡ لَـقَدِيۡرُ ۝۳۹ الَّذِيۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ بِغَيۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ‌ؕ (الحج ۲۲: ۳۹-۴۰) اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال

دیے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: ہمارا ربّ اللہ ہے۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جنگ کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ جنگ ان پر تھوپی گئی تھی۔ دشمنوں کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں کو، جو ابھی کم زور ہیں، ابتدائی مرحلے ہی میں کچل دیں اور اسلام کی شمع کو اپنی پھونکوں سے گُل کر دیں۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان کا منہ توڑ جواب دیں اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیں، لیکن اس وقت بھی انھیں تاکید کی گئی کہ ان کے ساتھ جتنی زیادتی کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لیں، حد سے تجاوز نہ کریں:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۝۱۹۰ (البقرہ ۲:۱۹۰) اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

● قرآن کریم میں مذکور آیاتِ قتال کا تعلق عام حالات سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دورانِ جنگ کے سلسلے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ جب کسی گروہ سے جنگ برپا ہو تو میدانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں برتتا، بلکہ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے مخالف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے اور اس کے افراد کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں قتل کر کے اس کی فوجی طاقت پارہ پارہ کر دے۔ اس موقعے پر کسی کم زوری اور نرمی کا مظاہرہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مثل ہے۔

● جنگ ایک ناپسندیدہ لیکن ناگزیر عمل ہے۔ مختلف مذاہب میں اس کے بارے میں احکام پائے جاتے ہیں۔ جن مذاہب میں جنگ سے متعلق کسی طرح کی تعلیم نہیں ملتی، ان کے پیروؤں کو بھی مختلف مواقع پر جنگ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ مذہبی کتابوں میں جنگ سے متعلق احکام وقوانین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا تعلق دشمن قوم کے ساتھ عام برتاؤ سے ہے، بلکہ ظاہر ہے کہ ان میں جنگ کی مخصوص صورت حال کا بیان ہے۔ مثال کے طور پر ہندومت کی مذہبی کتابوں (رِگ وید، یجروید، اتھروید وغیرہ) میں متعدد اشلوک جنگ پر ابھارنے والے ہیں۔ 'بھاگوت گیتا' کا تو موضوع ہی جنگ ہے۔ یہ کرشن کے اس طویل اپدیش پر مشتمل ہے، جو انھوں نے پانڈوؤں کے سردار ارجن کو جنگ پر ابھارنے اور لڑنے کی ترغیب دینے کے لیے دیا تھا۔

● ایک چیز یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان آیات کا خطاب، اسلامی ریاست اور اس کی فوج سے ہے۔ قرآن نے تمام مسلمانوں کو کھلی چھوٹ نہیں دے دی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں غیر مسلموں کو قتل کر دیں، بلکہ اسلامی ریاست سے دشمنی رکھنے والے غیر مسلموں سے جنگ کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف سربراہِ ریاست کو ہے۔ اسی کو طے کرنا ہے کہ جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور کی جائے تو کب اور کیسے؟ رعایا پر ہر حال میں اس کی اطاعت لازم ہے۔ علامہ ابن قدامہؒ نے لکھا ہے:

أَمْرُ الْجِهَادِ مَوْكُوْلٌ إِلَى الْإِمَامِ وَاجْتِهَادِهِ، وَيَلْزَمُ الرَّعِيَّةَ طَاعَتُهُ فِيمَا يَرَاهُ مِنْ ذٰلِكَ (المغنی: ج۹، ص ۲۰۲) ''جہاد کا معاملہ سربراہِ ریاست کے ذمّے ہے۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا اور رعایا پر اس کے فیصلے کو تسلیم کرنا لازم ہے۔

اسی طرح جس قوم سے جنگ ہو رہی ہو، اس کے صرف ان افراد کو قتل کرنے کی اجازت دی گئی ہے جو جنگ میں عملاً حصّہ لے رہے ہوں، یا اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غیر متعلق لوگوں سے تعرّض کرنے اور انھیں نشانہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْا شَيْخاً فَانِيًا وَلَا طِفْلًا وَلَا صَغِيْرًا وَلَا امْرَأَةً (ابوداؤد: کتاب الجہاد، باب فی دعاء المشرکین، حدیث: ۲۲۶۱) اور نہ قتل کرو کسی بوڑھے کھوسٹ کو، کسی بچے کو، کسی کم سن کو اور کسی عورت کو۔

قرآن کریم پر کیے جانے والے جملہ اعتراضات جذباتی نوعیت کے ہیں۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کے جذبات بھڑکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کے مختلف مقامات سے کچھ آیات منتخب کر لی جاتی ہیں اور انھیں سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے من مانے مفہوم بیان کیے جاتے ہیں۔ اگر ان آیات کا مطالعہ ان کے سیاق میں کیا جائے اور ان حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے، جن میں وہ نازل ہوئی تھیں تو کوئی اعتراض وارد نہیں ہوگا، بلکہ پڑھنے والے پر قرآن مجید کی سچائی اور معقولیت آشکارا ہوگی۔